حمیدہ شاہین کی شاعری: ایک نسائی اور شعری تجزیہ

The Poetry of Hameeda Shaheen: A Feminist and Poetic Analysis

DOI: https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2025.09022353**

ڈاکٹر خضریٰ تبسم

Dr Khizra Tabassum
Assistant Professor, Department of Urdu
Lahore College for Women University, Lahore

ڈاکٹر قدیر انجم باجوہ

Dr Qadeer Anjum Bajwa
Assistant Professor, Department of Urdu
Lahore College for Women University, Lahore

Abstract:

Feminine voices in contemporary Urdu poetry are increasingly diverging from classical traditions and engaging with their immediate social and cultural environments. Among these voices, Hamida Shaheen holds a significant place. Her poetry offers a distinctive synthesis of feminine sensibility and contemporary consciousness, through which she articulates a wide range of life experiences. Her verses reflect a deep concern with the erosion of moral values, the existential emptiness of the present era, systemic oppression and exploitation, resistance against class-based structures, and an intense lamentation over the disintegration of ethical norms and the anguish of a fractured societal order.

Keywords: Feminism, Urdu poetry, Hamida Shaheen, Consciousness, Moral values, lamentation

کسی بھی مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین ہر شعبہ ہائے زندگی میں متحرک اور فعال نظر آتی ہیں۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو یہاں بھی خواتین نے مردوں سے الگ اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی۔ افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، بانو قدسیہ اور دیگر خواتین نے نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے اردو افسانے کا دامن بھر دیا۔ اسی

طرح ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید اور دیگر خواتین شعرا نے اردو شاعری کی وقعت میں اضافہ کیا۔ خاص طور پر ۷۰ کی دہائی کے بعد لکھی جانے والی نظم میں شاعرات کے کردار سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان شاعرات کی نظموں میں نسائی حسیت اور تانیثیت دونوں یکجا ہو کر احتجاجی اور مزاحمتی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ دورِ حاضر کی شاعرات اپنے تخلیقی مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ غور کیا جائے تو نسائی شاعری معاشرے کے مسائل سماجی استحصال اور حقوق نسواں کی علمبردار ہے۔ خوف، احساس تنہائی، اپنی ذات کا اثبات، پدر سری معاشرے میں Survival، خود اذیتی، عائلی زندگی میں عدم آسودگی اور اعصابی تناؤ جیسے عوامل ان کی نظموں کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ اردو نظم کے معاصر منظر نامے پر موجود نسائی آوازیں نظم کی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول سے استفادہ کر رہی ہیں۔ انھی آوازوں میں ایک اہم آواز حمیدہ شاہین کی ہے۔

نسوانی احساسات کی حامل شاعرہ حمیدہ شاہین نے اپنے نسائی طرزِ احساس اور طرزِ فکر سے اپنی راہیں متعین کی ہیں۔ تاہم ان کے ہاں عصری شعور کی آمیزش سے زندگی کے متنوع تجربات کو بیان کرنے کا منفرد تجربہ سامنے آتا ہے۔ چونکہ حمیدہ شاہین ایک حساس دل رکھتی ہیں اس لیے جب وہ کسی کو دکھ یا تکلیف میں دیکھتی ہیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ ان کا ذاتی دکھ ہے۔ وہ معاشرتی انتشار اور کرب کو اپنی نظموں کا موضوع بناتی ہیں۔ مبشرہ علی حمیدہ شاہین کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "شاعرہ کا وژن وسیع ہونے کی بنا پر ان کی نظموں کے موضوعات وسیع تر منظر نامے کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اخلاقی اقدار کے انحطاط موجودہ صورتحال کی بے معنویت، جبر و استحصال، انسان کے نا انسان ہونے کا عمل، عرض تشکیک پر پلتی نا آسودگیوں، طبقاتی سماج کے خلاف احتجاج، اخلاقی اقدار کے مٹنے کا نوحہ، موجودہ نظام کی لاحاصلی کا کرب ملتا ہے۔"(۱)

حمیدہ شاہین کی اپنی زندگی میں بھی دکھ کی گہری کاٹ موجود ہے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا، والدہ کی جدوجہد، دوست جیسی عزیز بہن کا داغ مفارقت دے جانا، یہ سب حمیدہ شاہین کی شاعری میں دکھ کی کیفیت کے اسباب ہیں لیکن ان کی شاعری کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ معاشرتی انتشار، جبر و استحصال اور انسانیت کا دکھ ان کے ذاتی دکھ پر حاوی ہو کر داخلی کرب کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کا اظہار ان کی نظموں میں جا بجا ہوا ہے۔ اپنی کتاب "دستک" کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

"شعور نے جب بچپن کے تکیے سے سر اٹھایا اور انگڑائیاں لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تو خواب گاہ سے آنگن تک اس احساس کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پہلے قدم پر ہی پاؤں لہو لہان تھے۔ سلام ان ہاتھوں کو جنھوں نے راستے کی کرچیاں سمیٹ کر پھول بکھیرے، دعائیں ان بازوؤں کو جو سہارا بنتے رہے اور سجدہ شکر اس رب کے حضور جس نے شعر گوئی کی صلاحیت عطا کی۔"(۲)

حمیدہ شاہین کا پہلا شعری مجموعہ "دستک" ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ۳۵ نظمیں اور ۶۲ غزلیں شامل ہیں۔ "دستک" کی نظمیں اوائل عمری کے جوش سے لبریز ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں پختہ ذہنی شعور کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ انجم رومانی کے بقول:

"حمیدہ شاہین کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ ان شاعروں میں سے ہیں جو زندگی کو اپنے دور کے بدلے ہوئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور اپنے خاص انداز سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بالکل مختلف وژن کی شاعرہ ہے۔ اس کے شعر روایت سے منسلک رہتے ہوئے جدت کے حامل ہیں اور یہ جدت نئے دور کے طرز احساس سے پیدا ہوئی ہے۔"(۳)

حمیدہ شاہین کی شاعری متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کی نظم "چار رنگ زندگی کے" چار ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا رنگ لڑکپن کا ہے۔ یہ دور عموماً حسین سپنے بننے میں گزر جاتا ہے۔ دوسرا دور جوانی ہے جس میں محبوب کی آنکھیں ہی سراپا نگاری کرتی ہیں:

تم میرے پاس ہو
آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے
مجھ کو معلوم ہے
آج کل تیری آنکھوں اور میرے چہرے کا رنگ ایک ہے(۴)

تیسرا دور وہ ہے جب آنکھوں کے تابناک تارے بجھ جاتے ہیں۔ حسن اور جوانی اپنی رعنائی کھو دیتے ہے۔ چوتھا اور آخری دور وہ ہے جب آنکھیں مٹی ہو گئیں اور حسن کی جگہ بڑھاپے نے لے لی۔ حمیدہ شاہین کی نظموں کا ایک موضوع حیات و کائنات پر غور و فکر ہے۔ ان کے ہاں معاشرے اور کائنات کے حوالے سے منفرد اور پختہ شعور نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ہر گزرتے لمحے کی اہمیت کا احساس ہے:

"حمیدہ شاہین کی شاعری میں عمر، اس کی لاحاصلی اس کی اپنے آپ کو منوا لینے والی قوت اور ہونی کو مانتے ہوئے انہونی کی خواہش کا عمل بہت خوبصورت اور سچائی سے چہرہ کشا ہوئے ہیں اور میرے خیال میں اس کی شاعری کا یہ پہلو سب سے زیادہ قابل ذکر اور زندہ رہنے والا ہے۔"(۵)

اپنی بیشتر نظموں میں وہ قاری کو سوچ بچار کی دعوت دیتی ہیں کیونکہ سوچ بچار ایک مثبت عمل ہے۔ ان کی نظم "مدوجزر" کا پہلا مصرع میں اکثر سوچتی ہوں" ہی قاری کو غور و فکر کی ترغیب دلاتا ہے۔ شاعرہ علامتی انداز میں سمندر کی سطح پر رواں دواں سفینے کی داستان سنا رہی ہیں کہ اس چلتے سفینے میں مسافر بہت سکون سے سو رہے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں۔ کپتان کسی ملاح سے منتظر آنکھوں اور ہم سفر سمندر کے متعلق باتیں کر رہا ہو، ایسے میں اچانک کوئی سرکش موج آئے اور سفینہ دل کو ڈبو دے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اچانک دشمن ہواؤں کی شکل اختیار کر لیں سمندر اور مسافر دونوں عداوت کے لیے آمادہ ہوں:

صداؤں کا سمندر جاگ اٹھے
ادھر بھی ایک طوفاں ہو، ادھر بھی
سمندر بھی عداوت کر رہا ہو
مسافر بھی اس کی سمت لپکیں
سفینہ ڈوبتا ہو
تو پھر کپتان کیا محسوس کرتا ہو گا اس دم
بھلا کیا اس کی حالت ہو گی؟
وہی کچھ، جو اچانک یوں بدل جانے پہ تیرے
مجھے محسوس پل پل ہو رہا ہے
وہی حالت جو میری ہو رہی ہے (۶)

موجودہ دور میں جب انسان وجودی کرب اور شکست وریخت سے دوچار ہے، حمیدہ شاہین اشیا، زندگی اور کائنات کو وحدت میں دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ ان کی نظم "طاقت انتظار نیست" پانچ برابر اوزان کے مصرعوں پر مشتمل ہے۔ شاعرہ خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے اپنا ماتھا اس کے در پر پٹختی ہے۔ وہ خدا سے

باطنی بینائی کی طالب ہیں کیونکہ اس کے بغیر زندگی گزارنا بے معنی ہے:

ایک ایک سانس پر آن پڑے ہیں تیرے نام کے پردے
دیکھ یہ ماتھا لہو لہو ہے، اب تو اپنا در دے
توڑ دے اب تو زندان میرا، مجھ کو بال و پر دے
گونگی سوچ کو گویائی دے، من کو بینا کر دے
یا پھر کر دے ختم کہانی، عمر کا ساغر بھر دے(۷)

نظم ''اسوہ حسنہ'' آزاد نظم ہے۔ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے کہ نبی پاک ﷺ کی پیروی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ ممتحن کا استعارہ اللہ تعالی کی ذات ہے جس کا حکم ہے کہ اگر دنیا اور آخرت میں فلاح چاہتے ہو تو میرے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اتباع کرو۔ امتحان، پرچہ، نقل سب استعارے ہیں۔ نظم میں کہیں بھی اللہ اور رسولؐ کا ذکر نہیں ہے لیکن در حقیقت تمام نظم اسی ایک دائرے کے گرد گھومتی ہے:

کس قدر عجیب ہے
زندگی کا امتحاں
سارا پرچہ پہلے ہی
آؤٹ کر دیا گیا
اور اسی پر بس نہیں
ممتحن کمال ہے
کہہ رہا ہے پیار سے
کہ ہے تمہارے سامنے
ایک پرچہ حل شدہ
نقل تم کرو اسے
بہترین نقل ہے
بہترین اجر ہے(۸)

حمیدہ شاہین کی شاعری میں نسائی شعور کی جھلک بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ عورت ان کی نظموں کا

مرکزی موضوع ہے۔ وہ خواتین کے حقوق کے لیے اور انہیں معاشرے میں اہم مقام دلانے کے لیے سرگرم عمل دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کے ہاں تانیثی احتجاج کی باغیانہ روش سامنے نہیں آتی ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقم طراز ہیں:

> ”حمیدہ شاہین کے شاعرانہ ادراک کا ایک اہم اور غالباً مرکزی زاویہ تانیثی ہے اور اس زاویے کو اختیار کرتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا ہے یعنی انہوں نے تانیثیت کے قبول عام مفہوم (جو فیشن کا درجہ اختیار کر گیا ہے) کو نہیں اپنایا بلکہ ایک الگ راہ اختیار کی ہے۔“(۹)

ان کی نظموں میں تانیثی احتجاج تو موجود ہے لیکن وہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے نہایت سلیقے سے عورت کے مسائل اور مشکلات کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ تانیثیت کی مغربی تحریک سے متاثر ضرور ہیں تاہم ان کا احتجاجی رویہ مغرب سے قطع نظر دھیما اور سلجھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے بقول:

> ”عجیب بات ہے کہ حمیدہ شاہین کے یہاں نسائی ذات کی جو آگہی ظاہر ہوتی ہے، اس میں احتجاج و بغاوت کا غلغلہ نہ ہونے کے برابر ہے مگر ایک تمکنت اور اعتماد بہر حال موجود ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ آگہی نامکمل ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس آگہی میں وہ مشرقیت موجود ہے جسے مغربی تانیثیت اور مغرب زدہ تانیثیت انفعال سے تعبیر کرے گی مگر جو بعض باتوں کو اقدار کا درجہ اور ان اقدار کو مسلمات کا درجہ دیتی ہے اور یہ اقدار / مسلمات معاشرتی توازن کے لیے ناگزیر ہیں۔“(۱۰)

تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ترقی پذیر ممالک کا المیہ یہ ہے کہ وہ ۲۱ ویں صدی میں بھی عورت کو اس کے حقوق دلانے سے قاصر ہیں۔ آج بھی عورت ایک عضو ناکارہ کی مانند بے فائدہ اور بے مقصد گردانی جاتی ہے۔ پھر پدر سری معاشرے میں عورت کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر خیال کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمیدہ شاہین اس معاشرے سے نہ صرف نالاں ہیں بلکہ اس کے ظالمانہ رویے پر احتجاج بھی کرتی ہیں:

میری گردن میں موٹی زنجیر ہے
مجھے منہ کے بل گھسیٹا جاتا ہے
گلی گلی

شہر شہر
رشتہ رشتہ
مجھے ایندھن بنادیا گیا ہے
میں خود کو جلا کے کھانے تیار کرتی ہوں
سبزی کے ساتھ انگلیاں بھی کٹتی ہیں دل بھی
آٹے میں آنسوؤں کا نمک گوندھ کر
خود کو توے پر ڈالتی ہوں
گوشت کے ساتھ بھونتی ہوں(۱۱)

ایسے حالات میں جب مرد عورت کو عزت اور مان دینے میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے یا جان بوجھ کر اپنی انا کی تسکین کے لیے عورت کے جذبات کو مجروح کرتا ہے تو عورت کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرتے ہیں اور چونکہ کوئی اس کے جذبات کو نہیں سمجھتا اس لیے وہ اپنے رب کے حضور شکوہ کرتی ہے۔ نظم "فالتو پرزوں والی گاڑی کون چلائے" میں اسی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے:

میرے خالق
مجھے عورت کیوں بنایا؟
عورت بنانا اگر بہت ضروری تھا
تو بدن بنا دینا کافی تھا
سینے میں دل کیوں رکھ دیا
دل میں احساس کیوں رکھ دیا
یہاں تو خوبصورت چشم وابرو سے کام چلنا تھا
تو نے آنکھوں میں گہرائیاں اور گہرائیوں میں اشک کیوں رکھے
سچ اور جھوٹ کی پہچان کیوں بخش دی
غنچہ دہن بنا دیتا
دہن میں زبان اور زبان میں قوت گویائی کیوں رکھ دی ۱۲؎

"ڈسپوزیبل"، "قدر مشترک"، "بھلکڑ"، "مجھے ورثہ نہیں ملا"، "ٹھنڈی مٹی"، "حوا" اور دیگر نظموں میں نسائی جذبات کا شدید اظہار سامنے آتا ہے۔ یہ نسوانی احتجاج خالصتاً ان کے اپنے دل کی آواز ہے جسے کسی تحریک یا رجحان کے ساتھ وابستہ کرنا قطعی مناسب نہیں۔ڈاکٹر ستیہ پال آنند ان کی نظموں کے متعلق لکھتے ہیں:

"حمیدہ شاہین کی ایسی نظموں کو کراچی کی اس قلیل مدتی تحریک سے یا صنف نازک کے ساتھ اسلامی معاشرے کے سلوک کی اخباری خبروں سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ ان نظموں کی شناخت بالکل الگ ہے اور اگر ثانوی طور پر اس شناخت کو نسائی احتجاج کی شاعری سے جوڑ بھی دیا جائے تو ان کی شعری خصوصیات پر کوئی منفی اثر مرتب ہونے کا امکان نہیں ہے۔"(۱۳)

نظم "ان ڈور پلانٹ" استعاراتی انداز میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ نظم میں شاعرہ نے خود کو انڈور پلانٹ سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ پودا بھی ہوا، پانی اور روشنی کا محتاج ہے۔ اس کو زندگی گزارنے کے لیے ضروریات زندگی کی بھی ضرورت تو رہتی ہے۔ اس نظم میں "سائیں" کا لفظ بھی ہماری مقامی تہذیب اور روایات سے جڑا ہوا ہے۔ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

"لفظ ضیا کی دو معنیت سے قطع نظر اس نظم کا ایک refrain "سائیں" ہے جو شمالی برصغیر کی سب زبانوں میں "مالک" کے معنی میں برتا جاتا ہے۔ حقیقی اور مجازی خدا تو بہت جانا پہچانا ہوا زبان زد عام کلیشے ہے لیکن پنجابی میں تو "سر دا سائیں" ایک زبان دار کلمہ ہے۔ اس لیے یہاں یہ سمجھنے میں دقت پیش نہیں آئی کہ تخاطب اسی مرد سے ہے جسے ہندی میں "پتی پرمیشور" کہا گیا ہے۔"(۱۴)

نظم کے چند مصرعے دیکھیے اور حمیدہ شاہین کی فنی چابک دستی ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے کس عمدگی کے ساتھ "انڈور پلانٹ" کی زندگی کو عورت کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے نئے زاویہ سے نسوانی شعور بیدار کیا ہے:

میرے سائیں ضروری ہے بہت دو گھونٹ پانی بھی
جڑیں پیاسی ہوں تو شاخوں پہ ہریالی نہیں رہتی
نئی کونپل نہیں آتی

دمکتے سبز پتے زرد پڑ کر سوکھ جاتے ہیں
سنا ہے روشنی بھی لازمی عنصر ہے جینے کا
اندھیرے کا تسلسل زندگی کو چاٹ جاتا ہے
مجھے بھی زندہ رہنے کو ضیا درکار ہے سائیں
ہوا درکار ہے سائیں (۱۵)

نظم "ایک بے دھیانی" بھی استعاراتی اسلوب کی حامل ہے۔ شاعرہ خود کو ٹھنڈے توے پر ڈالی گئی روٹی سے تعبیر کرتی ہے جو ڈالنے والے کی بے دھیانی کی نذر ہو گئی۔ اس مختصر سی نظم میں جہان معنی کا خزینہ موجود ہے، نظم کی واحد متکلم کردار معاشرے اور خاص طور پر مرد کی عدم التفاتی کا شکار ہے۔ یہ مرد رشتے میں چاہے کوئی بھی ہو عورت کا استحصال ہر صورت میں کرتا ہے۔ نظم میں مرحلہ وار کچی روٹی کے مراحل دکھائے گئے ہیں۔ پہلے تو تو اہی مکمل طور پر گرم نہیں تھا پھر ڈالنے والے نے بھی بے توجہی برتی، پھر پلٹتے ہوئے بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ نتیجتاً روٹی کے کنارے الگ ہو گئے اور کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی پھر اُسے اچھی طرح سینکا بھی نہ جا سکا اس پورے عمل میں ایک پہلو بھی مثبت نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس روٹی کو چنگیر میں سجایا نہ سکا صرف ایک بے دھیانی کی وجہ سے پسنا، گوندھنا اور جلنا بیکار ہو گیا:

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
میرے کتنے ٹکڑے اکھڑ گئے
میں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پسنا، گندھنا اور جلنا
بیکار گیا، میں ہار گئی
اک بے دھیانی مجھے مار گئی (۱۶)

نظم "Self Suggestion" بھی تانیثی شعور کی عکاس ہے جس میں ایک لڑکی کو شادی کے بعد شروع

ہونے والی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جارہا ہے کہ شادی کے بعد سسرال کی خدمت اور اطاعت ہی لڑکی کی ذمہ داری ہے، چاہے اس کے لیے اسے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑے۔

نظم ''مشورہ'' میں ''ہرنی'' صنف نازک یا عورت کے لیے علامت ہے جسے زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ شیر ہمارے معاشرے میں موجود ان بھیڑیا نما مردوں کی علامت ہے جو گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو مفت کا مال سمجھ کر ہڑپ کر جانے کے درپے رہتے ہیں۔ نظم میں ''ہرنی'' کو مشورہ دیا جارہا ہے کہ باہر شیر گھات لگائے بیٹھا ہے اس لیے آج تم اپنی بھوک کی قربانی دے کر اپنی جان اور عزت بچاؤ۔ یہ نظم ہمارے معاشرتی نظام پر گہری چوٹ ہے۔

حمیدہ شاہین سماجی مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ سماجی مسائل میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ بڑھتا ہو اطلاق کا رجحان ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اس کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔ پدرسری معاشرے میں مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے طلاق دے کر عورت کو گھر سے باہر نکال سکتا ہے۔ شاعرہ کے خیال میں یقیناً یہ خدا کی مجازی خدا پر کی گئی نوازش ہے۔ بقول ڈاکٹر ستیہ پال آنند:

> ''حمیدہ شاہین ہمہ صفت شاعرہ ہیں اور وہ صرف من و تو کے دائرے کے اندر رہ کر ہی اپنی نظموں کو تخلیق نہیں کرتیں۔ اس مالہ وماعلیہ کی جہات تعداد میں زیادہ نہیں ہیں اور شاعرہ اس کے اندر رہ کر بھی اور اس سے باہر آکر بھی اس کی گوناگوں شخصی، ازدواجی اور سماجی سچائیوں کی تلاش کرتی ہیں۔ ایسا کرنے میں کہیں انجذاب سے یا درون بینی سے اور کہیں قیاس پر مبنی فکر فی نفسہ سے وہ اس امر کی تائید یا تردید چاہتی ہیں کہ من و تو کی بریکٹ میں جو تو ہے کیا وہ بھول سے یا بے اعتنائی سے، عادتاً بے پرواہی سے یا ایک سوچی سمجھی ہوئی بے توجہی سے (یا مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے کہ بمصداق) اسے اکیلا چھوڑ گیا۔''(۱۷)

''زندہ ہوں'' مجموعہ ۱۰۳ نظموں پر مشتمل ہے اور یہ تمام نظمیں اپنے اندر ایک وسیع دنیا لیے ہوئے ہیں۔ ان نظموں کا تعلق براہ راست زندگی کے ساتھ ہے۔ ان کے ہاں کوئی نیا پیرایہ اظہار استعمال نہیں ہوا اور یہی شاعرہ کی خوبی ہے کہ روایتی موضوعات کو نیا رنگ اور پیراہن دے کر قارئین تک پہنچا دیا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں:

"بیانیہ یا سٹیٹ منٹس یا سستی جذباتیت سے گریز کرتی ہوئی یہ نظمیں شاعرہ کے ذاتی غم کی گمبھیرتا سے گزر کر شعری تجربے کا روپ دھارتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم انہیں جدید طرز حسیت کی نمائندہ نظمیں کہہ سکتے ہیں۔"(۱۸)

ہمارے سماج میں بڑھتی ہوئی قابل اعتراض ویب سائٹس، کیبل نیٹ ورک اور کمپیوٹر کے بے مہار استعمال نے بے راہروی کو جنم دیا ہے۔ اسی بے راہ روی کی بدولت ریپ جیسے دل خراش واقعات کی تعداد میں ریکارڈ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ نظم "تین سالہ بچی کا ریپ" انتہائی دردناک پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ شدت تاثر کے باعث یہ نظم آفاقیت کے قریب پہنچ جاتی ہے:

دل کرتا ہے اس وحشی کے
سینے میں ایک خنجر ماروں
میرے بس میں ہوتا تو میں
اس وحشی کے سارے جسم پر
بال بال کی جڑ میں سوئیاں گاڑ کے زندہ دفن کراتی
کیوں کہ ایسے حیوانوں کو
عدم ثبوت کا فائدہ دے کر
اکثر چھوڑ دیا جاتا ہے(۱۹)

اسی طرح نظم "اعتبار ٹوٹا ہے" میں حمیدہ شاہین کی الفاظ پر دسترس بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی لفظیات موقع محل کے مطابق اور موضوع کی مناسبت کی بنا پر گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔ ان کی نظموں کے دو دائرے ہیں۔ پہلا ماورائی اور مابعد الطبیعاتی ہے جبکہ دوسرا دائرہ روزمرہ زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے ہاں شاعری کی عامیانہ سطح دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ اپنی نظموں کو زندگی کے تجربات سے اخذ کرتی ہیں۔ نظم "یقین سے باہر بکھرا ہو سچ" بھی اپنی نوعیت کی منفرد نظم ہے جس میں امیجز ایک نیا جہاں تخلیق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

"یہ عنوان کانسیپٹ کی سطح پر امیج کی بنت کاری ہے۔ اس زربافی میں دو الفاظ یقین اور سچ کانسیپٹ کے قبیل سے ہیں، لیکن باہر بکھرا ہوا، ان کے بصری منظر نامے کو چوکھٹا فراہم

کرتے ہوئے یا معنی بنا دیتا ہے۔"(۲۰)

نظم میں متحرک پیکر سازی کے ذریعے جمالیاتی سطح پر منفرد تجربہ سازی کی گئی ہے۔ نرم ملائم مہکتے ہوئے ریشمی بستر پر ٹوٹا ہوا کانچ بکھرا ہوا ہے۔ نشیلی نیند اور قرمزی پردوں پہ نامانوس تحریریں پیکر سازی میں نئے زاویے سامنے لاتی ہیں۔ نظم کے آغاز میں شاعرہ نے دو متضاد الفاظ نرم اور کھردرے سے شب خوابی کے کمرے کا ماحول ترتیب دیا ہے۔ اس ماحول کے نتیجے میں ذہنی کرب اور انتشار کا پیدا ہونا یقینی امر ہے اور یہی انتشار بعد کے مصرعوں میں وجودی کرب کا سبب بنتا ہے:

"مجھے یہ بھی نہیں معلوم، اب میں سانس کیسے لوں، کہ میری پسلیوں کو
کاٹتی اک ٹیس اٹھتی، ہے بدن میں پھیل جاتی ہے۔"(۲۱)

حمیدہ شاہین کی اکثر و بیشتر نظمیں معاشرے سے کشید کردہ شدتِ کرب کا بیانیہ ہیں۔ یہ کرب بعض مقامات پر ذاتی حیثیت بیانیہ اختیار کر جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی کرب قارئین پر کوئی تاثر چھوڑتا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ ایک اچھا شاعر اپنے ذاتی کرب کی طرف قارئین کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور پھر یہ کہ شاعر جن کیفیات کا اظہار کرتا ہے وہ معاشرے سے کشید کردہ ہوتی ہیں اور جو نظم عصری آشوب کو شعری اسلوب میں ڈھال کر پیش کی جاتی ہے وہ قارئین پر دیرپا نقوش ثبت کرتی ہے۔ ایک اچھی نظم کے لیے مواد، ہیئت اور خیال کے ساتھ ساتھ لفظیات، امیجز اور استعارات کا استعمال بھی لازم ہے کیونکہ نظم کا مقصد صرف حقیقت کی عکاسی نہیں بلکہ اس حقیقت کو منظر نگاری کی صورت میں پیش کرنا اصل کمال ہے۔ "ذوق جمال"، "نقاب"، "مٹی کا اجتہاد" اور ان جیسی دیگر نظمیں شاعرہ کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حمیدہ شاہین کی نظموں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان پر غزل کی کرافٹ کے اثرات نہیں ہیں۔ ان کی ہر نظم اکائی میں ڈھلتی محسوس ہوتی ہے اور قاری پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حمیدہ شاہین کی نظمیں جدید طرز حسیت کی ترجمان ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مبشرہ علی، حمیدہ شاہین کی شعری جہات، لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۷ء، ص:۱۲۶

۲۔ حمیدہ شاہین، دستک، لاہور: روش پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، پیش لفظ

۳۔ انجم رومانی، دستک، فلیپ

۴۔ حمیدہ شاہین، دستک، ص:۱۰۳

۵۔ امجد اسلام امجد، حمیدہ شاہین کی غزلیں، مشمولہ :دستک

۶۔ حمیدہ شاہین، دستک، ص:۳۹

۷۔ ایضاً، ص:۳۴

۸۔ ایضاً، ص:۳۵

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، دیباچہ، دشتِ وجود، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۶ء، ص:۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص۱۸

۱۱۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، لاہور: علی پرنٹرز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۳۱

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۷۱

۱۳۔ ستیہ پال آنند، حرف چند، مشمولہ :زندہ ہوں از حمیدہ شاہین، ص:۱۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۷

۱۵۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ص:۱۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۱۷۔ ستیہ پال آنند، حرف چند، مشمولہ :زندہ ہوں، ص:۱۶

۱۸۔ آفتاب اقبال شمیم، معنی کی بازیافت کا خواب، مشمولہ :زندہ ہوں از حمیدہ شاہین، ص:۲۲

۱۹۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ص:۱۶۶

۲۰۔ ستیہ پال آنند، حرف چند، مشمولہ :زندہ ہوں از حمیدہ شاہین، ص:۱۴

۲۱۔ حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، ص:۹۶